اکیسویں صدی کا نظم کار دماغ

(مابعدجدیدیت اور اضافیت کے تناظر میں)

ڈاکٹر شبیر حسین[1]م ڈاکٹر عاصمہ اصغر راؤ**

Abstract:

"This article, The Poem-Smith Creative Brain of 21st century: A study in the context of Post-Modernism and Relativisim, deals with the certain linings of the creative mind alive to the different socio-political, socio- cyberic and post- post modernist elements of the age.This article makes an effort to study contemporary *Urdu Nazm* as a product of the mind being affected of the trends ready to be outdated the day it is born. The great philosophical- cum- literary movement of Post Modernism has left us with the earthquake that marks no epicentre. Since, we are facing jolts and jerks of the creative ideas without pointing out the central force that throws it out as an art. Post-Modernism has ended up with the Relativism, an aftermath of the move.This article aims at opening a vantage point to read the contemporary poem under the study of Relativism."

اردو میں مابعد جدیدیت کے نقطہ آغاز کا واضح تعین کرنا ویسا ہی مشکل ہے جیسا کسی بھی ادبی تحریک کے سنِ پیدائش کو متعین کرنے میں ہوتا ہے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ابتدائی مظاہر یا اولین نقوش کن کن فن پاروں یا کونسی ادبی صورت حال کے زیادہ قریب ہیں مگر اس امر کا پورا زمانی احوال گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اس لیے معروف بات یہ ہے کہ اردو نظم کے اعتبار سے مطالعہ کرتے ہوئے مابعد جدیدیت کے عہد کا اندازہ آٹھویں عشرے کے قریب سے لگایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حامدی کاشمیری کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''اردو ادب میں مابعد جدیدیت کے ابتدائی مظاہر کی تعین و شناخت آٹھویں دہائی سے کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جدیدیت اپنے لگ بھگ پچیس سالہ سفر کے بعد اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی، اور اسے تاریخی تغیر کے اصول کے تحت یا تو زوال پذیری کا سامنا تھا، یا اپنی اثر انگیزی کو قائم رکھنے کے لیے توسیع و تقلیب کے مرحلے سے گزرنا تھا، اس تاریخی موڑ پر اس نے اپنے لیے موخر الذکر صورت کو روا رکھا، یعنی اس نے توسیع و تقلیب کے تدریجی عمل کو جاری رکھا، چنانچہ جدیدیت کے نظم نگاروں مثلاً محمد علوی، شہریار، وزیرآغا، بلراج کومل، عمیق حنفی، ساقی فاروقی اور مخمور سعیدی کے فوراً بعد قدم جمانے والی نسل کے شعراء کی نظموں میں اس کے اولین نشانات نظر آتے ہیں، بغور دیکھا جائے تو یہ نسل ساتویں دہائی میں اصلاً جدیدیت ہی کی توسیع کاری میں مصروف نظر آتی ہے، لیکن آٹھویں دہائی میں نظم نگاروں کی جو نسل سامنے آئی، وہ جدیدیت سے مختلف ہونے کا احساس دلانے لگی۔ ''(۱)

مابعد جدیدیت کے نقطہ آغاز کو اگر کسی معینہ سال سے یا سنہ سے منسوب کرنا ضروری ہو تو اسے جدیدیت کے ساتھ ہی فرق کرنا چاہیے۔ حامدی کاشمیری بھی یہی سمجھتے ہیں کہ جدیدیت مابعد

---

[1]لیکچرار، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

** چیئرپرسن، شعبہ اُردو، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور

جدیدیت شروع میں ایک دوسرے سے مماثل تھیں اور کسی حد تک مختلف بھی۔ اردو میں یہ دونوں رحجانات ایک دوسرے کو Over lap کرتے آئے ہیں۔ مگر ناصر عباس نیر جدید میں خط امتیاز کھینچنا مشکل کام سمجھتے ہیں مگر مابعد جدیدیت کے موجود مطالعہ سے وہ تاحال مطمئن نہیں ہیں:

''قدیم اور جدید میں فرق کرنا آسان ہے، مگر جدید اور مابعد جدید میں خط امتیاز کھینچنا مشکل ہے، اس لیے کہ اب ہم قدیم اور جدید دونوں سے فاصلے پر ہیں، دونوں کو معروض بنا کر ان کامطالعہ کیا جا سکتا ہے، جب کہ مابعد جدیدیت ہمارے اردگرد موجود ہے؛ ہمیں درپیش ہے اور ہم اس میں مبتلا ہیں۔ بنابریں اسے جدیدیت سے پوری طرح الگ کرنا دشوار ہے۔ یہ دشواری میٹل فوکو جیسے لوگوں کو بھی تھی۔ فوکو مابعد جدید Episte 'me کو ٹھیک ٹھیک نشان زد کرنے میں مشکل محسوس کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں، وہ عہد سانسوں کے ساتھ ہی ہمارے اندر اتر جاتا ہے اور ہم اس کے ضمن میں ایک قسم کی موضوعیت کا شکار ہوتے ہیں۔ اپنے عہد کے سلسلے میں موضوعیت چوں کہ اصول ہے، اس لیے نشاۃ ثانیہ کے عہد کا انسان بھی، اس عہد کے سلسلے میں موضوعیت کا شکار ہوا ہوگا اور وہ ثقافتی و فکری سطح پر برپا ہونے والی تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر رہا ہوگا۔ اسی لیے نشاۃ ثانیہ ۱۸۶۰ء کے بعد معرض بحث میں آئی، جب جرمن مورخ برخارڈت نے اس لفظ کو اپنی کتاب ''اٹلی میں نشاۃ ثانیہ'' میں برتا اور تب نشاۃ ثانیہ کو برپا ہوئے کم و بیش چار صدیاں گزر چکی تھیں۔ گویا کسی تبدیلی پر حقیقی معنوں میں بامعنی ڈسکورس اس وقت شرو ع ہوتا ہے جب وہ تبدیلی مکمل ہو چکی ہوتی ہے یا ثقافتی سطح پر اس کے اثرات فیصلہ کن انداز میں ثبت ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس امر کے پیش نظریہ غیر اغلب نہیں کہ آئندہ صدی میں مابعد جدیدیت پر نئے سرے سے ڈسکورس قائم ہو، جو آج کے مابعد جدید ڈسکورس سے مختلف ہو اور اس لیے ایک مختلف نام بھی تجویز کیا جائے؛ مابعد جدیدیت کو ایک موضوعی اصطلاح قرار دے کر رد کر دیا جائے۔''(۲)

مابعد جدیدیت عہد کی نظم کو کن خطوط پر مابعد جدید کہا جائے۔ اس کا تعین بھی بہت ضروری ہے لیکن اردو میں مابعد جدید اور عالمی طور پر مابعد جدید دونوں میں زمانی فرق تو شاید اتنا نہیں مگر اردو پر نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات کے مطالعات میں مابعد جدید کے تمام اطلاقات کو اردو کے حوالے سے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ہم مابعد جدیدیت کے تعین کے لیے جدیدیت کی شناخت (Identity) کو متعین کرنے کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں حامدی کاشمیری جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین فرق کرتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے کا مقابل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے کا ارتقا نہیں بلکہ اک دوجے کی ضد ہیں۔

مابعد جدیدیت کے شارحین کے مطابق مابعد جدید کے نکات کو یوں ترتیب دیا جانا چاہیے:

۱۔ جو تجربہ مقامی ہے، اپنے ہی تناظر میں قابل فہم اور قابل عمل ہے۔
۲۔ کوئی نظریہ، تصور، علمی حقیقی طور پر غیر جانب دار (Value Free) نہیں ہے۔
۳۔ تاریخ کا سفر لازماً آگے کی سمت نہیں ہوتا، تاریخ میں عدم تسلسل ہوتا ہے۔
۴۔ دنیا میں نقطہ ہائے نظر (ورلڈ ویوز) تصورات اورنظریات کی کثرت ہے۔
۵۔ آفاقیت کا دعویٰ اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی غرض نہیں ہے۔
۶۔ مطلق اتھارٹی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ طاقت کا مرکز نہیں ہے بلکہ طاقت مختلف اور متعدد مراکز میں بٹی ہوئی اور منتشر ہے۔
۷۔ کسی نظریہ، نظام اقدار، تصور یا ورلڈ ویو کو مرکزیت حاصل نہیں ہے۔
۸۔ کوئی شے آزاد، خودمختار نہیں ہے وہ دوسرے پر منحصر اور دوسروں سے جڑی ہوئی ہے۔
۹۔ حاشیے پر موجود علوم، طبقات، اصناف، ثقافتیں اتنی ہی اہم ہیں جتنی مرکز میں موجود اہم ہیں۔

۱۰۔ دنیا اور متن کی تعبیر کے کئی طریقے اور ان کی تعبیریں ممکن ہیں اور کوئی تعبیر حتمی اور آخری نہیں ہے۔ اس کے بعد مذہب افسانہ اور سماجی و سائنسی علوم جادو بن جاتے ہیں۔ کسی تعبیر کی قیمت پر اصرار دراصل اس تعبیر کی اجارہ داری قائم کرنا ہے۔
۱۱۔ آخری تجربے میں ہر علمی تصور، قدر سماجی تشکیل ہے چونکہ سماجی تشکیل ہے اس لیے آئیڈیالوجیکل ہے۔(۳)

یہ تمام نکات اور اس سے سامنے آنے والا نظامِ تخلیق جس صنف کو متاثر کرنے میں کلی طور پر کامیاب ہیں وہ 'نظم' ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے اجزاء ہیں جنہیں ما بعد جدیدیت کے ساتھ ملا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسے کہ مابعد جدیدیت کو اس کی فضا سے باہر نکل کر ٹھیک اسی ڈسکورس کے طور پر دیکھا گیا جس میں ثقافت اور سماج کا پورا حوالہ موجود ہوتا ہے ۔ مابعد جدیدیت کے زیر اثر تخلیق کار کو ایک مکمل ذہنی آزادی دی گئی کہ وہ طے شدہ اصناف کو نئے طریقوں سے دیکھ سکے۔ یوں ما بعد جدیدیت کا بنیادی طور پر اقتصادیات، سماج اور سیاست و ثقافت کے ساتھ اٹوٹ انگ کا رشتہ ہے ۔ یہ رشتہ ادب اور آرٹ سے ہوتا ہوا کسی حد تک مارکس کے خیالات سے جا ملتا ہے ۔ مابعد جدیدیت کو جو چیز سب سے زیادہ نمایاں کرتی ہے شخصی ذہنی آزادی کی بحالی ہے۔ ''شخصی ذہنی آزادی'' جسے جدیدیت نے بہت زیادہ پابند کر دیا تھا ۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مابعدجدیدیت غیرمشروط تخلیقی تجربے کا نام ہے جس میں تکثیریت کو بہت خاص اہمیت حاصل ہے جو ما بعد جدیدیت سے ایک انحراف ہے ۔ لیکن غور کیا جائے تو اس سے جذب کی صورتحال بھی نمایاں ہوتی ہے۔ کہ بہرحال یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس کا تعلق فرد اور سماج سے ہوتا ہوا ادب اور آرٹ سے جا ملتا ہے۔ تہذیب اور ثقافت سے مضبوطی کا یہی رشتہ مابعد جدیدیت کو وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے۔ یوں اس کا تعلق ادب اور آرٹ سے معنوی طور پر بہت گہرا ہو جاتا ہے۔

مابعد جدید نظم کسی نہ کسی صورت ان تمام بیان کردہ نکات سے مملو نظر آتی ہے۔ ۸۰ء کے بعد جو نظم نگار اردو شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں ان کے ہاں جدت اور انجذاب دونوں کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ جدت کو قبول کرنا ان کے لیے کسی روک کا سبب نہیں بنتا اور روایت سے جذب اٹھانا انہیں کسی صورت معیوب نہیں لگتا۔ ان شاعروں میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انہوں نے کائنات کے فکری مسائل کے لیے کسی ایک حل کو قبولنے سے تخلیقی طور پر انکار کیا۔ یہ کسی بھی ایسے نظریے کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے جو مکمل ضابطہ حیات اور تمام سوالوں کا حتمی جواب مہیا کرنے کا دعویٰ دار ہو۔ مابعد جدید نظم اس اعتبار سے ایک وسیع تناظر کی نظم ہے جس میں سب کچھ جزوی طور پر ٹھیک بھی ہو سکتا ہے اور جزوی طور پر غلط بھی۔

نظریاتی زنجیروں سے آزادی نے مابعد جدید نظم نگاری کو ایسی کشاد نظری سے نواز دیا کہ وہ ہر موضوع کو اپنا موضوع سمجھتی ہے اور کسی بھی ہیئت کو جائز یا ناجائز یا مکروہ قرار نہیں دیتی۔

ادبی تھیوری کے مباحث، لسانیات ، تشکیل اور رد تشکیل کے مباحث نے اردو نظم نگاروں کو بہت زیادہ متاثر نہ بھی کیا ہو تو بھی ان کے اثرات واضح طور پر مابعد جدید کی نظم اور معاصر نظم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

لسانیات نے اپنے تازہ ترمطالعات کے ذریعے لفظ اور معنی کی تعلق داری کو کئی دوسرے مصادر سے جوڑ دیا ہے۔ لہٰذا مابعد جدید نظم نگار اور معاصر نظم نگار دونوں کے ہاں لفظ کے تناظرات میں تکثیریت کا عمل واقع ہوا ہے۔ تکثیریت جو مابعد جدید کا ایک اہم عنصر ہے۔ تکثیریت کو معنی کے التواء کے لحاظ سے نظم کے شاعروں کے ہاں علامت اور استعارہ کی روایتی صورت جیسے تکثیر آشنا ہو گئی ہو۔ دریدا کے رد تشکیل کے نظریات نے معنی کے التوا کی خبر بہم پہنچائی۔ اس سے کوئی اور

فائدہ ہو نہ ہو یہ ضرور ہوا کہ ایک نظم نگار لفظ لکھنے میں بہت محتاط دکھائی دیتا ہے اور یہ اختیار کسی نظریہ کے خوف سے پیدا نہیں ہوا۔

بین المتونیت (Intertextuality) ایک ایسا تجربہ رہا جس نے ثقافت اور تاریخ کے ساتھ ادب کو نئے زاویوں سے دیکھنا شروع کیا۔ یہ تمام مباحث ادبی تھیوری کے مباحث تھے جنہوں نے نظم کو بھی برابر متاثر کیا اور شعری متن کو بھی ایک سماجی امر قرار دیا۔ گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

> ''اہل نظر جانتے ہیں کہ ادبی تھیوری کی نئی بحثوں نے ادبی متن کے حوالے سے آگہی کے کتنے ہی در وا کر دیے ہیں، اور کتنے ہی قدیمی مسائل پر از سر نو توجہ مرکوز ہوئی ہے۔ مثلاً ادب لاکھ انفرادی ذہن و فکر کا کرشمہ سہی، کوئی ادبی متن، متنِ محض نہیں ہے۔ ہر ادبی متن زبان ہی سے متشکل ہوتا ہے اور زبان سب سے بڑا سماجی مظہر ہے جو معاشرہ ہی میں قائم ہوتی ہے، اور معاشرے کی مخصوص ثقافت ہی کی رو سے ہی معنی کی حامل بنتی ہے یعنی ادب میں معنی آفرینی یا جمالیاتی اثر کا کرشمہ یہ سب اولاً ثقافت ہی کی رو سے ممکن ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی ادبی متن، متن محض نہیں ہوتا۔ ہر ادبی متن کسی نہ کسی طرح کی بین المتونیت (Intertetuality) کا حامل ہوتا ہے، اور یہ بین المتونیت خلا میں نہیں، ثقافت اور تاریخ کے محور پر عمل آرا ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ادب میں کوئی موقف معصوم Neutral نہیں ہے۔ یعنی فقط ادبی بیانات یا فیصلے ہی اقداری نہیں ہوتے، ہر متن میں جو نظریہ حیات بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر مضمر ہوتا ہے، مصنف کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو، وہ اقداری ہی ہوتا ہے اور ہر اقداری ترجیح کسی نہ کسی طور پر آئیڈیولوجیکل نوعیت کی حامل ہوتی ہے۔ گویا معنی تو آئیڈیولوجیکل تشکیل ہوتا ہی ہے، اور تو اور آئیڈیولوجی خود زبان کے اندر کھدی ہوئی موجود ہے۔ چوتھے یہ کہ متن میں معنی بالقوۃ موجود ہیں، انہیں بالفعل موجود قاری بناتا ہے اور قرأت کا تفاعل تمام تر ثقافت اور تاریخ کے محور پر واقع ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اور ایسے بہت سے دوسرے متعلقہ مسائل میں سے ہر مبحث ایک الگ مضمون کا مقتضی ہے۔ ان مباحث کوکتنا ہی پھیلا دیں، نتیجہ بہرحال وہی نکلے گا جو اوپرعرض کیا گیا کہ کوئی ادبی قدر، قدر محض نہیں ہوتی۔ یہ معنی کی حامل ہوتی ہے اور معنی کا سرچشمہ زندگی اور سماج کا تجربہ اور اس کے مسائل ہیں۔ چنانچہ سردست اسی پراکتفا کرنا مناسب ہے کہ ادبی قدر کا کوئی تصور بے تعلق معنی نہیں ہو سکتا اور ہر معنی زندگی اور ثقافت سے آتا ہے۔ بہرحال جدید نظم کی شعریات میں اس بارے میں جو غلطی سرزد ہوئی اس کی اصلاح وقت کا اہم تقاضا ہے۔''(۴)

ثقافتی کوڈز اور کنونشز کی طرف توجہ دلانے سے مقامیت کو فروغ ہوا۔ یہ فروغ فطری طور پر فکری اور تخلیقی فروغ ہے جس کا براہ راست تعلق موضوع کی آزادی اور اپنی زبان اور ثقافت پراعتماد بحال کرنے سے ہے۔

مقامیت اور تکثیریت سے زیادہ فائدہ اردو زبان جیسی متوسط زبان کو ہوا جس کو نو آبادیاتی عہد نے اپنے مطابق تشکیل دیا تھا۔ یوں ہر وہ شے جو جہاں کہیں بھی موجود تھی مکمل طور پر ظاہر سمجھی جانے لگی تھی اور نظم کاموضوع اور مواد ہونے کا شرف حاصل کر سکتی تھی۔

مابعد جدید نظم میں ہر شے اور ہر مظہر ''موضوع''(Subject Matter) ہو سکتاہے۔ بہت سے Taboos بھی اس عہد کی نظم میں ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ موضوعاتی سطح پر تمام نظریات ہی ایک وقت میں موجود بھی تھے اور ناموجود بھی۔ سب نظریات کے ابطال سے ''ہمہ نظری صورت حال'' نے جنم لے لیا، جس کے سبب کسی بھی نظریے کو رد کرنا بھی آسان ہوا اور اسے قبول کرنا بھی۔ مقامی ہیرو اور مقامی قدیم ثقافتی مظاہر اور اساطیر کی ازسرنو دریافت شروع ہوئی۔

یہ صورتحال نظم نگاری میں یوں بھی ایک خاصے کی چیز ثابت ہوئی کہ یہاں زبان اور اظہار میں روایتی طور پر لچک پیدا ہو چکی تھی تو مابعد جدید نظم نگاروں نے اس صورت حال سے پورا تخلیقی فائدہ حاصل کیا۔

جدید نظم نگاری نے حقیقت نگاری کے خلاف اور معنی کی تجریدی اور علامتی صورت کے حق میں عَلَم اٹھایا تھا۔ وہ استعارے، علامت اور اساطیر سے کام لے رہے تھے۔ مابعد جدید نظم نگاروں نے ان دونوں کے عمل کو قبول بھی کیا اور سماجی سروکار کو مضبوط کرتے ہوئے ایک نئے وسیلہ اظہار کو عام کرنے کا اعادہ بھی کیا جس میں حقیقت نگاری اور رومانویت دونوں الگ الگ بھی ہو سکتے تھے اور ایک ہی وقت میں ایک ساتھ بھی۔

مابعد جدید نظم نگاروں اور اکیسویں صدی کے ساتھ ہی شروع ہونے والی مابعد ماجدیدیت کے عناصر نے اردو نظم نگاروں کی آزادی کو ہر لحظہ قبول کر لیا۔ جس سے نظم نگاری میں بہت وسیع تر امکانات کے در وا ہوئے۔

اکیسویں صدی کو آغاز ہوئے دو عشرے مکمل ہو چکے ہیں۔ ان عشروں میں مابعد جدیدیت کی لہر نے جو کام شروع کیا تھا وہ اب اپنی فطری صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس عہد کے مطابق ابھی تک کوئی باقاعدہ نظری تحریک کا اعلان نہیں ہوا۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنی کتاب ''جدیدیت کے بعد'' میں معاصر اردو نظم کے منظر نامے پر رائے دیتے ہوئے اس سارے امر کو جدیدیت کے تسلسل کے طور پر دیکھا ہے اور جدیدیت کے اہم عنصر (Alienation) یا مغائرت کو مغربی اُترن بتایا ہے۔ ان کے مطابق تکنیک، آہنگ، ابہام، استعارے اور علامت جو جدیدیت میں بنیادی اہمیت کے حامل تھے وہ بھی محض تخلیقی خلاء کی پیداوارِ محض تھے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''اس صورت حال کو محسوس تو بہتوں نے کیا، لیکن اس پر لکھا بہت کم نے، اسلیے کہ جو نئی شعریات دی جا رہی تھی اس کا دبدبہ اس درجہ تھا کہ بہت کم لکھنے والوں کو اس بات کا خیال آیا کہ جس صنف نے مغربی ہیئتوں تک کو اپنے ثقافتی مزاج کی خراد پر اتار لیا، اب اس کو لے دے کر اس کی معنیاتی کائنات کو محدود کیا جا رہا ہے اور ثقافتی ڈسکورس کونقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ Alienation یعنی اجنبیت اور احساس شکست کا سارا کا سارا ایجنڈا مغرب کی اترن تھا۔ نئی شعریات کے شوق میں ہمارے نظریہ سازوں نے اسے بڑھ چڑھ کر اوڑھ لیا۔ آزادی کے بعد خوابوں کی پامالی اور دکھ کی فضا تو تھی ہی، کسی نے یہ نہ سوچا کہ دکھ اور مایوسی کی یہ فضا اور چیز ہے اور مغرب کی لایعنیت یا لغویت Absurdity کا فلسفہ اور چیز ہے جو زندگی کی بے معنویت اور فرومائیگی پر زور دیتا ہے۔ دونوں میں خلط مبحث جاری رہا۔ اور ایک ایسے زمانے میں جب معاشرہ اپنی ثقافت اور جڑوں پر اصرار کر رہا تھا، اور اقلیت نئے سماجی مسائل سے نبرد آزما تھی، اردو شاعری کو خوفِ تنہائی اور ذہنی کھوکھلے پن میں لگا کر زندگی کی حرکیت، حرارت اور تازگی سے محروم کر دیا گیا۔ جب معنیاتی ڈسکورس میں تازگی اور کشش نہ رہے اور جہان معنی دیوالیہ پن کا شکار ہونے لگے تو لامحالہ توجہ تکنیک و آہنگ اور فنی لوازم پر مرکوز ہونے لگتی ہے۔ ایجاز، احتصار اور اجمال کا احساس تو پہلے سے تھا اور بجا طور پر تھا، بعد کے دور میں دیکھا جائے تو سارا زور ابہام، استعارے، علامت اور رعایت لفظی پر صرف کیا جانے لگا، اور اس حد تک کیا جانے لگا گویا یہ چیزیں مقصود بالذات ہوں۔ نتیجتاً معنیاتی دنیا پس پشت جا پڑی اور نظم روز بروز تنوع اور تحرک سے محروم ہو کر یک سرے پن اور یکسانیت کا شکار ہوتی گئی۔ ''(۵)

ڈاکٹر نارنگ کی اپنی رائے قابلِ قدر ہے۔مگر مابعد جدید اور معاصر نظم نامہ میں عالمی معروض بہت مختلف شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس میں انٹرنیٹ اور جدید تیز تر مواصلاتی وسائل نے جس مشترکہ جہاں کو خلق کیا ہے اس میں ایک دوسرے سے فکری اور تخلیقی رحجان کالین دین اُترن جیسی مثالوں سے بہت مختلف ہے۔ نئی نظم یا آج کی نظم نے زبان کے لحاظ سے جو شعری روایت قائم کی ہے وہ اپنے پیش روؤں سے مختلف ہے۔ آج کے شاعر کی حیات اور اس کی کائنات جن مسائل اور معاملات سے عبارت ہے وہ کسی مخصوص سماجی نظریہ کی پابند نہیں ہے۔ آج کا نظم نگار بھی کسی نظری عینک سے اپنے معروض کو دیکھنے میں مصروف نہیں ہے۔ اس کے پاس ایسی جدید عینک ہے جو کئی

طرح کے لینز(Lens) پر مشتمل ہے اور ہزارہا زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ معاصر نظم گو شاعر اپنی ذات میں سمٹا ہوا نہیں ہے یا یوں کہیے کہ پورا معروض اس کے تخلیقی وجود میں سمٹ آیا ہے۔ اس مختلف رنگوں کی عینک لگائے کئی طرح کے Themes کو اپنے ذوق مطابق استعمال کرتا ہوا آج کا یہ شاعر حقیقت نگاری سے 'مہا حقیقت نگاری' یعنی Real سے Hyper real تک زقند بھرتا ہے۔ جہاں کہیں کجی دیکھتا ہے تو اس کا ردعمل بھی کئی صورتوں میں ڈھل جانے پر قادر ہے۔ وہ اس کجی کو تخلیقی طور پر درست بھی کر سکتا ہے اسے مزید بگاڑ کر قارئین کی توجہ مبذول کروا سکتا ہے۔ یا اسے ایسے فاصلے سے بھی دیکھ سکتا ہے کہ فطرت کے Land escspe میں اس کجی کے بغیر حسن ہی مکمل نہ ہو۔

شاعری پر ایک بات بڑے وثوق سے کی جاتی ہے کہ اگر اس کا زمانی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں کہیں کہیں موضوعات کے اشتراک کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ مابعد جدید نظم نے اردو معاصر نظم تک پہنچتے پہنچتے یہ معجزنمائی کر دکھائی ہے کہ ہر نظم نگار ایک مختلف فکری اسلوبیاتی اور ہیئتی منطقے کا آدمی ہے۔

گزشتہ دو دھائیوں میں کوئی بھی فیشن نہ تو اِن(in) ہوا اور نہ آؤٹ(out)۔ جس وقت جو بھی کہہ دیا جائے وہ اپنے نظم کے دائرے اور وجود میں اپنے ہونے کا جواز رکھتی ہو تو نظم کی کفایت ہو جاتی ہے۔

علامتوں، امیجز (Images)تشبیہ و استعارات کے استعمال اور تازہ کار تشکیل سے اردو نظم میں جتنے تجربات ہوئے ہیں اس سے پہلے اردو نظم کی تاریخ میں دکھائی نہیں دیتے۔ ایک نظم اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک علامت بھی ہو سکتی ہے اور اشارہ بھی۔

مابعد جدیدیت کا ایک اہم فیچر یہ بھی ہے کہ کہیں Capital "T" سے کوئی Truth موجود نہیں ہے بلکہ ہر جگہ Small "t" کے ساتھ بہت سے truths موجود ہیں۔ یوں تو یہ نظریہ مرکزیت پر چوٹ لگاتا ہے اور کسی ایک ابدی اور ازلی سچ کی جستجو کو دیوانے کا خواب بتاتا ہے مگر جب یہ اردو نظم نگاری میں جھلکتا ہے تو روایت اور جدت کو بھی ایک ہی وقت میں مکمل وجود تسلیم کرتا ہے۔ جہاں ہیئت کو نئے سے نئے تجربے سے گزارا جا رہا ہے وہاں اردو نظم نگاروں کے ہاں بالخصوص گزشتہ کچھ سالوں سے روایتی ہیئتوں کو نظم میں برتنے کا رجحان بھی دیکھا جا رہا ہے۔

''عشرہ'' اور ''پرونیٹ'' جیسے کچھ تجربات نظم میں سامنے آئے ہیں جن کو رفتہ رفتہ قبولیت بھی حاصل ہو رہی ہے۔ عشرہ پابند ہیئت کی روایت کا از سر نو اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ موضوعات اور اوزان نیز نثر اور نظم دونوں کے انتخاب میں آزادی کے سبب روایت اور جدت کا انجذاب ہے۔

زبان کے لحاظ سے اگر نئی اور آج کی معاصر نظم کا جائزہ لیا جائے تو فضیل جعفری سے اتفاق ضروری ہو جاتا ہے۔ جب وہ رقم طراز ہوتے ہیں:

> ''موضوعات کی طرح شعری زبان کے سلسلے میں بھی ہمیں نظم میں کئی دھارے اور ان دھاروں کو کاٹتے ہوئے دوسرے دھارے نظر آتے ہیں، ویسے بعض مشترک خصوصیتوں کی بنا پرنئی نظم کی زبان کا یقینا ایک مجموعی کیرکیٹر بھی ہے،اگر مجھے نئی نظم کی زبان کے اس مجموعی کردار کے بارے میں کچھ تھیوریٹیکل قسم کی باتیں کرنے کی اجازت دی جائے تو میں یوں کہوں گا کہ زبان کے معاملے میں نئے نظم نگاروں کا رویہ کم و بیش وہی ہے جو جدید ماہرین نفسیات کا ہو سکتا ہے۔ نیا شاعر عموماً اس بات پر زور دیتا ہے کہ شعری زبان کو انسان کے اندر کرب اور داخلی انتشار کو من و عن بیان کرنے کے قابل ہونا چاہیے چنانچہ مستعمل اور فرسودہ انداز بیان نیز زبان کے بنے بنائے سانچوں میں ان کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہ جاتی۔''(۶)

آج کے نظم نگار کی زبان اس کے خیال کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ ہر طرح کے لفظ کو خیال کے بہاؤ کے ساتھ استعمال کرنے کی فطری اجازت معاصر اردو نظم نگار کے پاس موجود

ہے۔ نئی ٹیکنالوجی اور اس کے ساتھ آنے والی لفظیات کو معاصر نظم میں جگہ پانے یا قارئین کو انہیں قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ کا سامنا نہیں ہے۔

نئے معاصر نظم نامے میں صنف کی تخصیص بھی کوئی اہم شے نہیں ہے۔ ہر لکھنے والا تقریباً نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کر رہا ہے۔ تانیثیت کی تحریک نے بھی اردو نظم کو بہت سے موضوعات سے متعارف کروایا تھا جن کو شاعر و شاعرات نے یکساں طور پر اپنی نظموں کے موضوعات کے طور پر استعمال کیا۔

گزشتہ دس سالوں نے آج کے فرد کی نفسیات کو بہت گہرا کر دیا ہے۔ میڈیا چینلز کی بھرمار نیٹ کے ذریعے لوگوں کے نظریات اور ضروری و غیر ضروری معلومات کے لا مختتم بہاؤ نے انسانی ذہن کو کنفیوژن سے دوچار بھی کر رکھا ہے۔ صارفیت نے آسانیوں کے ساتھ مشکلات کے بھی راستے کشادہ کیے ہیں۔ اس عہد میں انسانی ذہن بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ انسانی تعلقات بھی کئی صورتوں اور نتیجتاً کئی پیچیدگیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔

معاصر نظم آج کے انسان کے اس پیچیدہ ذہن کی نمائندہ بھی ہے۔ بعض ناقدین نے مستقبل میں اردو ادب کو ایک ایسے عہد سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وژن کیا ہے جو ان کے مطابق ''عہد مرگ'' ہوگا۔

> ''آنے والے دنوں میں اردو ادیب ایک ایسی قومی اور بین الاقوامی صورت حال میں ادب تخلیق کرے گا جسے 'عہد مرگ' کہا جا رہا ہے کہ اس دور میں وقفے وقفے سے نظریے کی موت، تاریخ کی موت، ادب کی موت کا اعلان بڑے وثوق سے کیا جا رہا ہے۔ شوبز، منڈی معیشت، ذرائع ابلاغ کا دھوم دھڑکا، یک رخا سیاسی اور معاشی نظام ایک زبان اور ایک ثقافت کے تصور نے ادیب کو خاصا کنفیوژ کرنیکی کوشش کی ہے کیونکہ کنفیوژن پھیلانا انسان کو بے سمت رکھنا اور اسے انتشار اور ہزار رنگ کے نظریات سے متصادم کرنا اس دور کا رویہ ہے۔ ایک بات یہ اہم ہے کہ ان پچاس برسوں میں اردو نے نظریات، مفروضات کے اتنے کچھ ہنگامے دیکھے ہیں کہ اب کسی شور شرابے یا نظریاتی ہنگامہ آرائی سے نہ اسے الجھن ہوتی ہے اور نہ وحشت، اسی لیے ساختیات اور اس سے متعلق مباحث اردو ادب کے مانوس میلانات اور رویونمیں کوئی بڑا شگاف پیدا نہ کر سکے۔ ''(۷)

درج بالا اقتباس سے راقم ''کنفیوژن'' کی حد تک متفق ہے اور ''عہد مرگ'' جیسی ترکیب بنانے پر بھی مصنف کو آزاد سمجھتا ہے مگر یہ کہ ساختیات نے کوئی بڑا شگاف پیدا نہیں کیا کوئی زیادہ قابل اعتبار رائے معلوم نہیں ہوتی۔

ساختیات و دیگر متعلق مباحث نے محض''لسانی سطح پر سماجی تناظرات کے فکری پھیلاؤ کا ادب میں اظہار'' کو ایک قابل ذکر اور دلچسپ موضوع سمجھا ہے۔

ان مباحث نے فکری طور پر ہمارے ادیبوں اور نظم نگاروں کومحتاط کیا ہے اور لسانی تناظرات کے احوال کو سمجھتے ہوئے ڈکشن اور دیگر بیانیہ وسائل کوملحوظ رکھتے ہوئے الرٹ رہنے اور اس صورت حال سے تخلیقی سطح پر فائدہ اٹھانے پر آمادہ کرنے کی سعی کی ہے جس میں یہ مباحث خاصے کامیاب ہوئے اور اس سے الگ ان سے کسی بڑے شگاف کی امید کرنا غیر متعلق ہے کہ یہ بہرحال مابعد جدیدیت کی توسیع کی صورت میں سامنے آنے والے مباحث ہیں جو کسی بھی تحریک کو ''بڑا شگاف'' پیدا کرنے سے معزول قرار دیتی ہے۔

معاصر اردو نظم ان تمام تبدیلیوں اور تیزی سے بدلتی ہوئی ٹیکنالوجی، سماجی و سیاسی صورتحال کے مطابق اپنے وجود کو پورے احساس کے ساتھ آئے دن ایک تازہ بہ تازہ سوال اور موضوع کے ساتھ موجود ہے۔ معاصر اردو نظم اپنے مضبوط وجود کے ساتھ روشن تر امکانات پر قائم ہے اور یونہی پھلتی پھولتی رہے گی۔

حوالہ جات

۱۔ حامدی کشمیری، ''مابعد جدید نظم''، مشمولہ؛**اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ**، مرتبہ؛ گوپی چند نارنگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۱۷

۲۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، **لسانیات اور تنقید**، اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم ،۲۰۱۴ء، ص ۱۷۸۔۱۷۷

۳۔ حامدی کشمیری، ''مابعد جدید نظم''، مشمولہ؛**اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ**، مرتبہ: گوپی چند نارنگ،ص ۲۱۹

۴۔ گوپی چند نارنگ،**جدیدیت کے بعد**، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۶۔ فضیل جعفری، ''نئی نظم کی زبان''، مشمولہ؛ **نئی نظم** (تجزیہ اور انتخاب)، مرتبہ؛ نئی دہلی : زبیر رضوی، مکتبہ ذہن جدید ،۲۰۰۷ء، ص ۱۳۵۰

۷۔ زبیر رضوی ،''آزادی کے بعد اردو نظم''، مشمولہ؛ **نئی نظم** (تجزیہ اورانتخاب)، ص ۱۴۹